A11 3/286
All 6/285

فیض احمد فیض

سرِ وادیِ سینا

10037

WOMEN'S COLLEGE
M. A. Road, Srinagar.
General Library Books

کتابی دنیا...... لکھنؤ

موسم آیا تو نخلِ دار پہ میرؔ
سرِ منصور ہی کا بار آیا

ٹیلیفون نمبر۔۔۔۔ ۲۶۳۳۵

891.U
F 175 S

پبلشر :۔۔۔۔۔۔۔۔کتابی دنیا نظیر آباد۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔ لکھنؤ

پرنٹر :۔۔۔۔۔۔۔۔سرفراز قومی پریس۔۔۔۔۔۔۔ لکھنؤ

فہرست

مریم (سلگانیک) کے نام

LIBRARY
18037

فیضؔ

دی جی کیرنن

ترجمہ سحر انصاری

میں فیض سے کوئی بیس سال قبل اس وقت متعارف ہوا تھا جب وہ ایم۔اے۔او۔ کالج امرتسر میں لیکچرار تھے۔ ایک اور پرانے دوست جو اس وقت فیض کے رفیق کار تھے، کل اچانک ایڈنبرا میں دکھائی دیئے اور ان سے مل کر مجھے بیتے ہوئے دن یاد آ گئے۔ معلوم یہ ہوا کہ فیض کو یہ ذمہ داری سونپی گئی تھی کہ وہ اس قدیم دوست کی ایڈنبرا میں آمد سے مجھے مطلع کریں گے لیکن وہ بھول گئے۔ اس زمانے میں بھی وہ اپنی بھول جانے کی عادت اور غائب دماغی کی وجہ سے خاصے مشہور تھے۔ لیکن ان کے طالبعلم ان کی اس عادت کو آسانی سے درگزر کر دیتے تھے کیونکہ اگر کوئی پروفیسر یہ بھول جائے کہ اسے طلبہ کو لیکچر دینا تھا تو انھیں کبھی اس کا افسوس نہیں ہوتا۔ اسی طرح تانگہ چلانے والوں کا بھی ان کے ساتھ یہی رویہ تھا کیونکہ وہ کسی کے گھر جا کر

باتوں میں مصروف ہو جاتے اور یہ بھول جاتے کہ باہر تانگہ کھڑا ہوا ہے اور اس طرح تانگے والوں کا کرایہ بڑھتا رہتا تھا۔ اور ادبی لوگ انھیں یوں معاف کر دیتے تھے کہ وہ اس وقت بھی ایک اہم شاعر تھے۔

مجھے یہ معلوم کر کے بڑی مسرت ہوئی کہ اس ہفتے لندن میں ایک ادبی تقریب ان کے اعزاز میں منعقد کی جا رہی ہے اور مجھے اس کا افسوس ہے کہ میں خود وہاں حاضر ہونے سے قاصر ہوں۔ گزشتہ بار کوئی پانچ سال قبل جب وہ انگلستان آئے تھے تو ایک ایسی ہی تقریب میں شریک ہونے کا مجھے شرف حاصل ہوا تھا۔ اس تقریب کے فوراً بعد فیض یورپ روانہ ہو رہے تھے تاکہ وطن واپس جا سکیں جہاں انھیں جیل میں ڈال کر ان کا پرجوش خیر مقدم کیا گیا۔ کئی ادبی شخصیتوں کی زندگی میں اس قسم کی خفیف غلط فہمیاں پیدا ہوتی رہی ہیں۔ اس بار وہ نسبتاً زیادہ طویل مدت کے لیے انگلستان میں قیام کر رہے ہیں تاکہ خوش قسمتی سے ان کے دوستوں کو مستقبل قریب میں اسی قسم کی کسی اور غلط فہمی کا خوف باقی نہ رہے نیز کسی محب وطن شاعر کو اپنے وطن سے خواہ کتنا ہی لگاؤ کیوں نہ ہو یہ امر خاصا دل خوش کن ہوتا ہے کہ بعض اوقات وہ (کسی دوست کی طرح) بہت قریب سے جائزہ لینے کے بجائے چار یا پانچ ہزار میل کے فاصلے سے اپنے وطن کے بارے میں غور و خوض کرے۔

یہ امر بلاشبہ افسوسناک ہے کہ فیض مع اہل و عیال ہمارے

یہاں کے متعدد پُرسکون اور رومان انگیز مقامات مثلاً میرے آبائی شہر مانچسٹر یا لیک ڈسٹرکٹ جہاں ایک زمانے میں اتنے سارے شاعروں نے عروج پایا، یا سب سے بڑھ کر ایڈنبرا میں رہنے کے بجائے لندن میں سکونت اختیار کر رہے ہیں۔ اسی شہر میں، جو اینٹوں، کہر، شور و غل اور اہالیان لندن کا ایک دیو ہیکل مجموعہ ہے۔ ڈاکٹر جانسن کہا کرتے تھے کہ جب آدمی لندن سے اکتا جاتا ہے تو وہ زندگی سے اکتا جاتا ہے لیکن یہ اٹھارویں صدی میں ہوتا تھا آج تو یہ کہنا زیادہ صحیح ہوگا کہ جب آدمی زندگی سے اکتا جائے تو وہ لندن کا رخ کرتا ہے۔

فیض بلا کے سگرٹ نوش واقع ہوئے ہیں۔ یہ بُری عادت لندن کے کہر اور دھند کے ساتھ مل کر کہیں اُن کی انتہائی تابناک صلاحیتوں کو ماند نہ کر دے، تاہم مجھے کامل یقین ہے کہ اپنی بیوی اور بچیوں کی مدد سے وہ اس مسئلے پر قابو پالیں گے۔ نیز یہ کہ ایک ادبی شخصیت کی حیثیت سے اس ملک میں ان کا قیام حقیقی معنوں میں تخلیقی ثابت ہوگا۔ وہ اب تک بہت کچھ کر چکے ہیں لیکن انھیں ابھی اور بہت کچھ کرنا ہے۔ اور اب جبکہ وہ دوسرے ہنگاموں سے آزاد ہیں انھیں یقیناً خیال آئے گا کہ اُن سے کس قدر زیادہ توقع کی جاتی ہے۔ ان بیس برسوں میں مجھے یقین ہے کہ میں نے انھیں اس قسم کے موضوعات پر کم از کم بیس کتابیں لکھنے کا مشورہ دیا ہے، جدید معاشرے میں فنکار کا مرتبہ، تاریخ ادب اُردو یا مغربی تہذیب کے مقابلے

میں اسلامی تہذیب کی نوعیت وغیرہ وغیرہ۔

ہر شخص کو جو ان سے واقف ہے فطری طور پر یہ توقع بھی ہوگی کہ وہ اپنے فرصت کے اوقات میں مزید نظمیں لکھیں گے۔ میری ہمیشہ سے یہ خواہش بھی رہی ہے کہ وہ دوسرے ممالک کی بعض نظمیں خصوصاً ہمارے عہد کی ترقی پسند شاعری کا ترجمہ اُردو میں کریں جو اسی روایت یا عالمی تحریک سے تعلق رکھتی ہو جس سے خود ان کی شاعری وابستہ ہے۔ ویسے جارج بارو جنھوں نے آئرستان، ڈنمارک اور دوسرے علاقوں کی شاعری کو انگریزی میں منتقل کرنے کی کوشش کی ہے، اپنی ایک کتاب لیونگرو (LAVENGRO) میں لکھتے ہیں کہ "ترجمہ زیادہ سے زیادہ ایک بازگشت ہی ہوتا ہے" تمام ترجمہ کرنے والے یقیناً یہی محسوس کرتے ہوں گے لیکن کچھ نہ ہونے سے بازگشت بھی بہرحال بہتر ہے اور فیض کی پیدا کردہ بازگشت کم از کم مترنم ضرور ہوگی۔

گزشتہ دنوں اُن سے یہ سُن کر میں بے حد متاثر ہوا کہ خود اُن کی بعض نظمیں سواحلی زبان میں ترجمہ ہونے کے بعد مشرقی افریقہ میں پڑھی جا رہی ہیں۔ جہاں ایک ملک گیر زبان کی حیثیت سے سواحلی کا مستقبل بہت تابناک نظر آتا ہے مجھے امید ہے کہ جلد ہی دوسری زبانوں میں بھی ان کے کلام کا ترجمہ ہو جائیگا۔

ایک اسکاٹ خاتون نے جو کئی سال تک افغانستان میں رہی ہیں فیض کے والد کے بارے میں ایک کتاب لکھی ہے جو اُس زمانے میں

وہاں وزیرِ اعلیٰ تھے، مصنفہ کے بیان کے مطابق وہ بڑے پختہ عزم و ارادہ کے مالک تھے اور انتہائی انتشار کے ماحول میں نظم و نسق قائم کرنے کی کوشش کر رہے تھے۔ امرتسر کی آزادانہ زندگی کے زمانے سے فیض بھی بادوسرے متعدد باحوصلہ انسانوں کے دوش بدوش اس جد و جہد میں مصروف ہیں کہ ہمارے جدید عہد کے انتشار میں ضبط و توازن قائم کیا جائے جو کبھی کبھی افغانستان کے دورِ قدیم سے زیادہ مایوس کن نظر آتا ہے۔ میں ایک اور ریشت کو سرگرم عمل دیکھنے کا خواہاں ہوں اور چشمِ تصور سے فیض کی بیٹیوں کو اپنی اپنی رغبت کے عظیم کارناموں کی تکمیل میں منہمک دیکھ بھی رہا ہوں، ان میں ایک کو غالباً پاکستان کی پہلی عظیم مصورہ کی حیثیت سے اور دوسری کو شاید پہلی خاتون صدر کی حیثیت سے۔

دریں اثنا فیض کے دوستوں کو ہر ہفتے کے خاتمے پر ان سے دریافت کرتے رہنا چاہیے کہ انھوں نے کتنے صفحات لکھ لیے ہیں اور ہر روز شام کو معلوم کرتے رہنا چاہیے کہ انھوں نے کتنے سگریٹ نہیں پئے ہیں۔

۲۷ نیلس اسٹریٹ

ایڈنبرا

۵ر دسمبر ۱۹۶۲ء

؎ فیض کے والد سلطان احمد خاں افغانستان میں چیف سکریٹری کے عہدے پر مامور تھے

ایک حوصلہ مند دل کی آواز

الیگزینڈر ژمرکوف

ترجمہ سحر انصاری

متاع لوح و قلم چھن گئی تو کیا غم ہے
کہ خون دل میں ڈبو لی ہیں انگلیاں میں نے
لبوں پہ مُہر لگی ہے تو کیا کہ رکھ دی ہے
ہر ایک حلقۂ زنجیر میں زباں میں نے

ماسکو میں دسمبر کی ایک سرمازدہ شام کو زندگی میں پہلی بار فیض کے ان ولولہ خیز اشعار نے میرے دل میں اضطراب پیدا کیا تھا۔ ۱۹۵۸ء کا سال رخصت ہو رہا تھا اور برف کا ایک طوفان پشکن کے سرمئی مجسمے کے گرد نغمہ ریز تھا پہرہ دار سپاہی چوراہوں پر کھڑے سردی سے کانپ رہے تھے۔ ماسکو کے ایک گرم اور آرام دہ فلیٹ میں مشرقی سوویٹ کی دوست جمہوری ریاستوں کے شعراء اور بیرونی مشرقی ممالک سے آئے ہوئے مہمانوں کی محفل میں ہندوستان کے شاعر علی سردار جعفری

ایک نا آشنا زبان کے اشعار تقریباً گنگنانے کے انداز میں پڑھ رہے تھے۔ اشعار سب کے دلوں کو مسحور کرتے جا رہے تھے۔ ان اشعار میں محبت کے نازک جذبوں کی کسک تھی زندان کی تنہا کوٹھری میں مقید انسان کا غم تمنا تھا اور ایک انقلابی کا شعلہ خیز غیظ و غضب بھی تھا۔ یہ اشعار فیض احمد فیض کے تھے جو ہماری صحبت میں شامل نہ ہو سکے تھے اور ماسکو سے بہت دور منٹگمری جیل میں تنہائی کے شب و روز بسر کر رہے تھے اسی لمحہ شاید وہ جیل کی سلاخوں سے باہر کا منظر دیکھ رہے ہوں گے۔ وہ رخشندہ ستاروں سے معمور آسمان کو تک رہے ہوں گے یا پھر شاید اپنے حوصلہ مند دل پُر سوز کی گہرائی میں جنم لینے والے مصرعے سرگوشی کے انداز میں دہرا رہے ہوں گے

تین ماہ بعد۔۔۔ وقت وہی تھا جو ماسکو میں گزشتہ موسم سرما کی ہواؤں کی موجودگی میں تھا۔ میں نے ایک بار پھر ایسے اشعار سُنے جو دل کو اپنی طرف کھینچ لیتے ہیں اور ان کے تاثر کی توانائی ہی سے مفہوم اور تفہیم کی منزلیں طے ہونے لگتی ہیں۔

اس وقت میں دہلی میں تھا۔ مارچ کا آغاز تھا۔ سیاہ جنوبی آسمان پر بیشمار ستارے جھلملا رہے تھے اور اس پس منظر میں سدا بہار درخت رات کی دھند میں لپٹا ہوا نظر آ رہے تھے، لال قلعہ کی دُور اُفتادہ اور سنگین دیواروں کے سائے میں گاڑیاں خاموشی سے گزر رہی تھیں اور رکشا چھلاووں کی طرح بھاگ رہے تھے، وہ سب اس مقام کی سمت رواں دواں تھے جہاں قمقموں سے روشن وسیع و عریض، زنگارنگ پنڈال، سبزے کے قطعات اور بے شمار رنگین

پھولوں سے لدے ہوئے نامانوس درخت اپنی بہار دکھا رہے تھے۔

پنڈال میں ایک مشاعرہ ہو رہا تھا۔ یکے بعد دیگرے، شاعر مائیکروفون پر آئے رہے اور مشاعرے میں جان پڑتی رہی اور پھر جعفری نے چند ایسی نئی نظموں کا آغاز کیا جو منٹگمری جیل کے تنہا کمرے کی اداس اور سنگین دیواروں میں مقید رہ کر لکھی گئی تھیں۔

اب فیضؔ وہاں اپنی اسیری کا پانچواں سال گزار رہے تھے۔

رنگ برنگے پنڈال میں اچانک سناٹا اور ارتعاش پذیر سکوت چھا گیا۔ ہر لفظ صاف سنائی دے رہا تھا، ایک ایک لفظ دلوں میں اترتا چلا جا رہا تھا، اور ایسے مقامات پر جہاں شاعر کے اشعار احساس کی گہرائی میں ڈوب جاتے اور پھر غیظ و غضب کی بازگشت بن کر ابھرتے تو جیسے سارا پنڈال ایک دم بیدار ہو جاتا اور نغمہ گر کی آواز کے ساتھ ساتھ بڑے جوش و خروش سے داد دینے لگتا۔

اس وقت میں فیضؔ احمد فیضؔ کے بارے میں کیا جانتا تھا؟

یہی کہ اپنے عوام کو نوآبادیاتی نظام کی غلامی سے آزاد کرانے کی جدوجہد میں وہ جوانی کے زمانے سے ہی تن دہی کے ساتھ شامل ہیں۔ مجھے معلوم تھا کہ دوسری جنگ عظیم کے زمانے میں فاشزم سے اپنی نفرت کے اظہار کے لیے وہ بدیسی اینگلو انڈین فوج میں ایک افسر بن گئے تھے اور جنگ کے بعد

کرنل کی حیثیت سے سبکدوش ہوئے۔ وہ ایک پُر جوش صحافی تھے جو نوآبادیاتی شکنجے اور مقامی آقاؤں کی غلامی سے اپنے عوام کو آزاد کرانے کے تصورات کو فروغ دینے کے لیے جان و دل سے سرگرم عمل ہے۔

فیضؔ اپنی شاعری، اپنی سیاسی تحریروں اور ایک پرخلوص انقلابی کی حیثیت سے اپنی سرگرمیوں کے ذریعے پاکستان کے بہترین فرزندانِ وطن کے دوش بدوش بے غرضی اور جوش و خروش کے ساتھ جدوجہد میں مصروف ہیں۔ رجعت پسند اس باکمال شاعر کی قوت صداقت اور توانائی الفاظ سے خوف زدہ تھے۔ چنانچہ عذاب تنہائی اور جبری بیکاری کا شکار بنانے کے لیے انھوں نے منٹگمری اور حیدرآباد کی جیلوں میں فیضؔ پر پانچ سال کی طویل اسیری مسلط کر دی تھی لیکن شاعر کے زندہ اور حیات پرور دل کی دھڑکنوں پر سنگلاخ زندان کی تاریک رات غالب نہ آسکی اور نہ ایام اسیری کی بے حس اور جامد خاموشی ان کے نغموں پر کوئی مہر سکوت ثبت کر سکی۔

زندان کی سنگین دیواروں میں بھی ان کے حوصلہ مند دل سے وہ نغمے بیتاب ہو کر نکلتے رہے جو عوام، زندگی اور مادرِ وطن کی محبت سے لبریز تھے۔ ان کے نغمات کے پیروں کی سرسراہٹ پاکستان اور متعدد دوسرے ممالک کی سرزمین پر سنائی دیتی رہی اور لاکھوں انسانوں کے دلوں کو گرماتی

رہی۔

آخر کار رجعت پسندی کی تیرگی اور انقلابی شاعری کی روشنی کی جنگ میں شاعری ہی کامران و فتح مند رہی۔ خطرے اور وہ بھی موت کے مسلسل خطرے سے عبارت پانچ سال کی قید و بند کی صعوبتیں ختم ہوئیں اور محبِ وطن شاعر آزاد ہو گیا۔ ایک بار پھر ماضی کی طرح، بلکہ اس سے بھی زیادہ جوش اور ولولہ کے ساتھ اس جدوجہد کو جاری رکھنے کے لیے جس کی خاطر اس نے اپنی زندگی وقف کر دی تھی۔ اپنے ہموطنوں کے لیے، تمام اقوام کے مابین دوستی کو فروغ دینے کے لیے اور تمام انسانوں کے لیے امن کی فضا پیدا کرنے کے لیے ـــــ اور اب زنگ خوردہ زنجیروں اور ہتھکڑیوں کی گرفت سے آزاد ہو کر وہ زیادہ توانائی اور جذبے کی سچائی کے ساتھ اپنے شعلہ صفت نغمات فضا میں بکھیر رہا ہے۔

۱۹۵۸ء کے موسم خزاں کے بعد تاشقند میں افرو ایشیائی ادیبوں کا مشہور اجلاس ہوا جس میں فیض نے ایک مقتدر قائد کی حیثیت سے شرکت کی۔ وہاں ان سے پہلی بار میری ملاقات ہوئی۔ اس شاعر سے ملاقات ہوئی جس کا تصور میں اپنے دل میں بسائے ہوئے تھا۔

فیض کے لیے وہ نسبتاً اُداسی کا زمانہ تھا۔ پاکستان میں حکومت کا تختہ اُلٹ کر غیر جمہوری طاقتوں نے اقتدار سنبھال لیا تھا۔

ماسکو میں ادیبوں کی انجمن کے ایک کمرے میں ہم بیٹھے ہوئے تھے۔ ہم دونوں نظمیں پڑھ رہے تھے اور روسی زبان میں فیض کی نظموں کا ایک مجموعہ شائع کرنے کی بابت بات چیت کر رہے تھے۔ پھر اتفاق سے ہماری گفتگو کا رخ نظموں سے ہٹ کر اس وقت کی سیاست کی طرف ہو گیا۔

تو پھر مستقبل قریب میں آپ کا کیا ارادہ ہے؟

فیض نے اپنی سیاہ آنکھوں سے، جن کی گہرائی میں قدرے اداسی تھی، میری طرف دیکھا۔ لیکن ان کے ہونٹوں پر ہلکی سی مسکراہٹ موجود تھی

"بس، پہلے تو میں لندن جاؤں گا، وہاں اپنے بعض دوستوں سے ملوں گا جو ابھی پاکستان سے آئے ہیں۔ اس کے بعد ظاہر ہے کہ میں کراچی، لاہور، اپنے وطن واپس چلا جاؤں گا۔۔۔"

"لیکن آپ جانتے ہیں کہ اب وہاں۔۔۔"

ان کے ہونٹوں کے کناروں پر وہی ہلکی سی مسکراہٹ تھی۔

"ظاہر ہے کہ اس صورت میں تو مجھے وطن ہی واپس جانا چاہیے۔"

"تو پھر جیل یقینی ہے۔۔۔۔"

"شاید۔۔۔۔ اور اگر کسی بڑے مقصد کی خاطر انسان کو جیل بھی جانا

پڑے تو ضرور جانا چاہیے۔"

"لیکن اگر...... جیل سے بھی بدتر کچھ ہو تو.....؟"

شاعر نے کھڑکی سے باہر کی طرف دیکھا جہاں باغ کے وسط میں ٹالسٹائے کا مجسمہ نصب تھا، سرد اور خزاں زدہ آسمان پر نظر ڈالی۔ مسکراہٹ بدستور موجود تھی۔ چند لمحے کے توقف کے بعد انھوں نے اپنے مخصوص انداز میں آہستہ سے کہا،

"اگر جیل سے بھی بدتر کوئی چیز ہوگی تو پھر یقیناً برا ہوگا۔ لیکن تم جانتے ہو جدوجہد بہرحال جدوجہد ہے....."

یہ تھا ان کا پرسکون لیکن پراعتماد جواب۔

میں اپنی زندگی میں ایسے متعدد افراد سے مل چکا ہوں۔ ان میں سے بہت سے نڈر، بے باک اور جرأت مند بھی تھے اور اپنی زندگی کے نصب العین کی تکمیل میں جان و دل سے منہمک بھی۔ وہ ہر قسم کی اذیت یہاں تک کہ ناگزیر موت برداشت کرنے کا بھی حوصلہ رکھتے تھے۔

فیض میں یہ ضبط و تحمل اور یہ اعتماد، اذیت کوشی اور موت سے نبرد آزمائی کی بدولت پیدا ہوا ہے۔ ایک ایسی موت جو جدوجہد کے لیے خود کو وقف کر دینے والوں کے لیے ناگزیر ہوتی ہے۔

"تاہم مصائب و ابتلا کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر دیکھنے کی جو جرأت

فیض میں تھی اس نے میرے سارے وجود کو ڈگمگا دیا

فیض کی شاعری کا ترجمہ کرنے کی غرض سے میں نے ان کا ایک ایک مصرع بڑے غور سے پڑھا۔ میری کوشش یہ تھی کہ جہاں تک ممکن ہو (ترجمہ شدہ) مصرعوں میں ترنم اور ان کے احساس اور حوصلہ مند دل کا جذبہ برقرار رہے۔ اس کوشش میں نہ صرف ان کے اشعار کا جذباتی زیر و بم، جسے دوسری زبان میں منتقل کرنا تقریباً ناممکن ہے، بلکہ ایک جانباز اور شاعر انسان کا پرسکون اور واضح ضبط و تحمل میری روح میں گونجنے لگا۔ شاعر، جس نے ایک انقلابی کی حیثیت سے خود اپنی زندگی کو ایک نغمے میں ڈھال لیا اور اپنے نغمے کو جد و جہد کا ایک موثر ہتھیار بنا لیا ہے۔ جد و جہد کے مراحل سے گزرتے ہوئے مشرق کے ایک ممتاز ترین ترقی پسند شاعر فیض احمد فیض کے ان نغمات کو سوویت قارئین سے روشناس کراتے ہوئے مجھے بے پایاں مسرت ہو رہی ہے۔

مطالعہ کے دوران فیض کی شاعری میں ابتلائے اسیری کا تاثر بھی محسوس ہوتا ہے جس سے دل اداس ہو جاتا ہے۔ لیکن پھر شعلہ خیز جوش و جذبہ اس تاثر پر غالب آ جاتا ہے۔

تیرگی کا استعارہ ان کی شاعری میں بار بار آتا ہے لیکن وہ اشعار زیادہ تابناک ہیں جن میں شاعر کے وطن پر طلوع ہونے والی سحر کے نور

اولیّن کا خیر مقدم کیا گیا ہے اور مطالعہ کرنے والا یقیناً محسوس کرے گا
کہ آزادی کی محبت اور شاعر کے مصائب زدہ وطن کو حقیقی شاعری کس
طرح ہم آہنگ و ہم رنگ کر دیتی ہے۔

(روسی زبان میں مجموعۂ کلام کا دیباچہ ۱۹۶۲ء)

انتساب

آج کے نام

اور

آج کے غم کے نام

آج کا غم کہ ہے زندگی کے بھرے گلستاں سے خفا

زرد پتّوں کا بن

زرد پتّوں کا بن جو مرا دیس ہے
درد کی انجمن جو مرا دیس ہے
کلرکوں کی افسردہ جانوں کے نام
کرم خوردہ دلوں اور زبانوں کے نام
پوسٹ مینوں کے نام
تانگے والوں کے نام
ریل بانوں کے نام
کارخانوں کے بھولے جیالوں کے نام

بادشاہِ جہاں، والیٔ ماسوا، نائب اللہ فی الارض

دہقاں کے نام

جس کے ڈھوروں کو ظالم ہنکا لے گئے ہیں

جس کی بیٹی کو ڈاکو اٹھا لے گئے ہیں

ہاتھ بھر کھیت سے ایک انگشت پٹوار نے کاٹ لی ہے

دوسری مالیے کے بہانے سے سرکار نے کاٹ لی ہے

جس کی پگ زور والوں کے پاؤں تلے

دھجیاں ہو گئی ہے

اُن دُکھی ماؤں کے نام

رات میں جن کے بچّے بلکتے ہیں اور
نیند کی مار کھائے ہوئے بازوؤں سے سنبھلتے نہیں
دکھ بتاتے نہیں
منّتوں زاریوں سے بہلتے نہیں

اُن حسیناؤں کے نام

جن کی آنکھوں کے گُل

چلمنوں اور دریچوں کی بیلوں پہ بیکار کھِل کھِل کے

مرجھا گئے ہیں

اُن بیاہتاؤں کے نام

جن کے بدن

بے محبّت ریاکار سیجوں پہ سج سج کے اُکتا گئے ہیں

بیواؤں کے نام

"کٹڑیوں"[1] اور گلیوں، محلوں کے نام

جن کی ناپاک خاشاک سے چاند راتوں

کو آ آ کے کرتا ہے اکثر وضو

جن کے سایوں میں کرتی ہے آہ و بکا

آنچلوں کی حنا

چوڑیوں کی کھنک

کاکلوں کی مہک

آرزومند سینوں کی اپنے پسینے میں جلنے کی بُو

---

[1] کٹڑی کٹڑے کی تصغیر۔ پنجابی میں ملحقہ مکانوں کے احاطے کو کہتے ہیں۔

پڑھنے والوں کے نام

وہ جو اصحابِ طبل و علم
کے دروں پر کتاب اور علم
کا تقاضا لئے، ہاتھ پھیلائے
پہنچے، مگر لوٹ کر گھر نہ آئے
وہ معصوم جو بھولپن میں
وہاں اپنے ننھے چراغوں میں لو کی لگن
لیکے پہنچے جہاں
بٹ رہے تھے، گھٹا ٹوپ، بے انت راتوں کے سائے

اُن اسیروں کے نام

جن کے سینوں میں فردا کے شب تاب گوہر

جیل خانوں کی شوریدہ راتوں کی صرصر میں

جل جل کے انجم نما ہو گئے ہیں

آنے والے دنوں کے سفیروں کے نام

وہ جو خوشبوئے گل کی طرح

اپنے پیغام پر خود فدا ہو گئے ہیں

(ناتمام)

۱۹۶۵ء

لہو کا سراغ

زنداں زنداں شورِ انا الحق محفل محفل قلقلِ مے

دست و کشکول نہیں کاسۂ سر لے کے چلو

یہاں سے شہر کو دیکھو

یوں سجا چاند کہ جھلکا ترے انداز کا رنگ

غم نہ کر

بلیک آؤٹ

کس حرف پہ تو نے گوشۂ لب اے جانِ جہاں غمّاز کیا

سپاہی کا مرثیہ

لہو کا سراغ

کہیں نہیں ہے کہیں بھی نہیں لہو کا سراغ
نہ دست و ناخنِ قاتل نہ آستیں پہ نشاں
نہ سرخیٔ لبِ خنجر، نہ رنگِ نوکِ سناں
نہ خاک پر کوئی دھبّا نہ بام پر کوئی داغ
کہیں نہیں ہے کہیں بھی نہیں لہو کا سراغ
نہ صرفِ خدمتِ شاہاں کہ خوں بہا دیتے
نہ دیں کی نذر کہ بیعانۂ جزا دیتے

نہ رزم گاہ میں برسا کہ معتبر ہوتا
کسی علم پہ رقم ہو کے مشتہر ہوتا
پکارتا رہا، بے آسرا یتیم لہو
کسی کو بہرِ سماعت نہ وقت تھا نہ دماغ
نہ مدعی، نہ شہادت، حساب پاک ہوا
یہ خونِ خاک نشیناں تھا، رزقِ خاک ہوا

کراچی ——— جنوری ۱۹۶۵ء

زنداں زنداں شورِ انا الحق، محفل محفل قُلقُلِ مے
خونِ تمنّا دریا دریا، دریا دریا عیش کی لہر
دامن دامن رُت پھولوں کی، آنچل آنچل اشکوں کی
قریہ قریہ جشن بپا ہے، ماتم ماتم شہر بہ شہر

کراچی ـــــــــــــــ جنوری ۱۹۶۵ء

(گلاب کا پھول سابق صدر ایوب خاں کا انتخابی نشان تھا)

دیدۂ تر پہ وہاں کون نظر کرتا ہے
کاسۂ چشم میں خوں نابِ جگر لے کے چلو
اب اگر جاؤ پئے عرض و طلب اُن کے حضور
دست و کشکول نہیں کاسۂ سر لے کے چلو

کراچی ——— جنوری ۱۹۶۵ء

یہاں سے شہر کو دیکھو

یہاں سے شہر کو دیکھو تو حلقہ در حلقہ
کھنچی ہے جیل کی صورت ہر ایک سمت فصیل
ہر ایک راہ گزر گردشِ اسیراں ہے
نہ سنگِ میل، نہ منزل، نہ مخلصی کی سبیل

جو کوئی تیز چلے رہ تو پوچھتا ہے خیال
کہ ٹوکنے کوئی للکار کیوں نہیں آئی

جو کوئی ہاتھ ہلائے تو وہم کو ہے سوال
کوئی چھنک، کوئی جھنکار کیوں نہیں آئی

یہاں سے شہر کو دیکھو تو ساری خلقت میں
نہ کوئی صاحبِ تمکیں، نہ کوئی والیِ ہوش

ہر ایک مردِ جواں مجرمِ رسن بہ گلو
ہر اک حسینۂ رعنا، کنیزِ حلقہ بگوش

جو سائے دور چراغوں کے گرد لرزاں ہیں

نہ جانے محفلِ غم ہے کہ بزمِ جام و سبو

جو رنگ ہر در و دیوار پر پریشاں ہیں

یہاں سے کچھ نہیں کھلتا یہ پھول ہیں کہ لہو

کراچی ——————— مارچ ۱۹۶۵ء

یوں سجا چاند کہ جھلکا ترے انداز کا رنگ
یوں فضا مہکی کہ بدلا مرے ہمراز کا رنگ

سایۂ چشم میں حیراں رُخِ روشن کا جمال
سرخیٔ لب میں پریشاں تری آواز کا رنگ

بے پیے ہوں کہ اگر لطف کرو آخرِ شب
شیشۂ مے میں ڈھلے صبح کے آغاز کا رنگ

چنگ و نے رنگ پہ تھے، اپنے لہو کے دم سے
دل نے لے بدلی تو مدھم ہوا ہر ساز کا رنگ
اک سخن اور کہ پھر رنگِ تکلّم تیرا
حرفِ سادہ کو عنایت کرے اعجاز کا رنگ

اپریل ۱۹۶۵ء

غم نہ کر، غم نہ کر

درد تھم جائے گا غم نہ کر، غم نہ کر

یار لوٹ آئیں گے، دل ٹھہر جائے گا، غم نہ کر، غم نہ کر

زخم بھر جائے گا

غم نہ کر، غم نہ کر

دن نکل آئے گا

غم نہ کر، غم نہ کر

ابر کھل جائے گا، رات ڈھل جائے گی

غم نہ کر، غم نہ کر

رُت بدل جائے گی

غم نہ کر، غم نہ کر

جون ۱۹۶۵ء

بلیک آؤٹ

جب سے بے نور ہوئی ہیں شمعیں
خاک میں ڈھونڈتا پھرتا ہوں نہ جانے کس جا
کھو گئی ہیں میری دونوں آنکھیں
تم جو واقف ہو بتاؤ کوئی پہچان مری
اس طرح ہے کہ ہر اک رگ میں اتر آیا ہے

موجِ دَر موج کسی زہر کا قاتل دریا

تیرا ارمان، تری یاد لیے جان مری

جانے کس موج میں غلطاں ہے کہاں دل میرا

ایک پل ٹھہرو کہ اُس پار کسی دنیا سے

برق آئے مری جانب، یدِ بیضا لے کر

اور مری آنکھوں کے گم گشتہ گہر

جامِ ظلمت سے سیہ مست

نئی آنکھوں کے شب تاب گہر

لوٹا دے

ایک پل ٹھہرو کہ دریا کا کہیں پاٹ لگے

سرِ وادیٔ سینا۔

18037

اور نیا دل مرا

زہر میں ڈھل کے، فنا ہو کے

کسی گھاٹ لگے

پھر پئے نذر نئے دیدہ و دل لے کے چلو

حسن کی مدح کروں، شوق کا مضمون لکھوں

ستمبر ۱۹۶۵ء

کس حرف پہ تو نے گوشۂ لب اے جانِ جہاں غماز کیا

اعلانِ جنوں دل والوں نے اب کے بہ ہزار انداز کیا

سو پیکاں تھے پیوستِ گلو، جب چھیڑی شوق کی لَے ہم نے

سو تیر ترازو تھے دل میں جب ہم نے رقص آغاز کیا

بے حرص و ہوا، بے خوف و خطر، اس ہاتھ پہ سر، اس کف پہ جگر

یوں کوئے صنم میں وقتِ سفر نظارۂ بامِ ناز کیا

جس خاک میں مل کر خاک ہوئے وہ سرمۂ چشمِ خلق بنی
جس خار پہ ہم نے خوں چھڑکا، ہمرنگِ گُلِ طنّاز کیا

لو وصل کی ساعت آ پہنچی، پھر حکمِ حضوری پر ہم نے
آنکھوں کے دریچے بند کیے اور سینے کا در باز کیا

ستمبر ۱۹۶۵ء

سپاہی کا مرثیہ

اٹھو اب ماٹی سے اٹھو

جاگو میرے لال،

اب جاگو میرے لال

تمہری سیج سجاون کارن

دیکھو آئی رین اندھیارن

نیلے شال دوشالے لے کر

جن میں اِن دکھین اکھین نے

ڈھیر کیے ہیں اتنے موتی

اتنے موتی جن کی جیوتی

دان سے تمہرا

جگ جگ لاگا

نام چمکنے

اٹھو اب ماٹی سے اٹھو

جاگو میرے لال

اب جاگو میرے لال

گھر گھر بکھرا بھور کا کندن

گھور اندھیرا اپنا آنگن

جانے کب سے راہ تکے ہیں

بالی دُلھنیا ، بانکے ویرن

سونا تمہرا راج پڑا ہے

دیکھو کتنا کاج پڑا ہے

بیری بیرا جے راج سنگھاسن

تم ماٹی ہیں لال

اٹھو اب ماٹی سے اُٹھو ، جاگو میرے لال

ہٹ نہ کرو ماٹی سے اُٹھو ، جاگو میرے لال

اب جاگو میرے لال

سنہ ۱۹۶۵ء

۱۹۷۷ء

ایک شہر آشوب کا آغاز

دیوارِ شب اور عکسِ رخِ یار سامنے

کیسے آرزو سے پیماں جو مآل تک نہ پہنچے

ایک شہر آشوب کا آغاز

اب بزمِ سخن صحبتِ لب سوختگاں ہے

اب حلقۂ مے طائفۂ بے طلباں ہے

گھر رہیے تو ویرانیٔ دل کھانے کو آوے

رہ چلیے تو ہر گام پہ غوغائے سگاں ہے

پیوندِ رہِ کوچۂ زر چشمِ غزالاں

پابوسِ ہوس افسرِ شمشاد قداں ہے

یاں اہلِ جنوں یک بہ دگر دست و گریباں

واں جیشِ ہوس تیغ بکف درپئے جاں ہے

اب صاحبِ انصاف ہے خود طالبِ انصاف

مہر اس کی ہے میزان بہ دستِ دگراں ہے

ہم سہل طلب کون سے فرہاد تھے لیکن

اب شہر میں تیرے کوئی ہم سا بھی کہاں ہے

سنہ ۱۹۶۶ء

دیوارِ شب اور عکسِ رخِ یار سامنے
پھر دل کے آئینے سے لہو پھوٹنے لگا
پھر وضعِ احتیاط سے دھندلا گئی نظر
پھر ضبطِ آرزو سے بدن ٹوٹنے لگا

۱۹۶۶ء

کیسے آرزو سے پیماں جو مآل تک نہ پہنچے
شب و روزِ آشنائی مہ و سال تک نہ پہنچے

وہ نظر بہم نہ پہنچی کہ محیطِ حسن کرتے
تری دید کے وسیلے خد و خال تک نہ پہنچے

وہی چشمۂ بقا تھا جسے سب سراب سمجھے
وہی خواب معتبر تھے جو خیال تک نہ پہنچے

نہ الطف وجہ تسکیں، نہ قرار شرحِ غم سے
کہ ہیں دل میں وہ گلے بھی جو ملال تک نہ پہنچے

کوئی یار جاں سے گزرا، کوئی ہوش سے نہ گزرا
یہ ندیم یک دو ساغر، مرے حال تک نہ پہنچے

چلو فیضؔ دل جلائیں کریں پھر سے عرض جاناں
وہ سخن جو لب تک آئے پہ سوال تک نہ پہنچے

سنہ ۱۹۶۶ء

۱۹۶۷ء

سوچنے دو

نہ کسی پہ زخم عیاں کوئی نہ کسی کو فکر رفو کی

سروادیٔ سینا

دعا

دلدار دیکھنا

ہارٹ اٹیک

سوچنے دو

(آندرے وزنیسن سکی کے نام)

اک ذرا سوچنے دو

اس خیاباں میں

جو اس لحظہ بیاباں بھی نہیں

کون سی شاخ میں پھول آئے تھے سب سے پہلے

کون بے رنگ ہوئی رنج و تعب سے پہلے

اور اب سے پہلے

کس گھڑی کون سے موسم میں یہاں
خون کا قحط پڑا
گُل کی شہ رگ پہ کڑا
وقت پڑا
سوچنے دو
اک ذرا سوچنے دو

یہ بھرا شہر جو اب وادیِ ویراں بھی نہیں

اس میں کس وقت کہاں

آگ لگی تھی پہلے

اس کے صف بستہ دریچوں میں سے کس میں اوّل

زہ ہوئی سرخ شعاعوں کی کماں

کس جگہ جوت جگی تھی پہلے

سوچنے دو

ہم سے اس دیس کا تم نام و نشاں پوچھتے ہو
جس کی تاریخ نہ جغرافیہ اب یاد آئے
اور یاد آئے تو محبوب گزشتہ کی طرح
روبرو آنے سے جی گھبرائے
ہاں مگر جیسے کوئی
ایسے محبوب یا محبوبہ کا دل رکھنے کو
آنکلتا ہے کبھی رات بتانے کے لیے

ہم اب اُس عمر کو آ پہنچے ہیں جب ہم بھی یونہی
دل سے مل آتے ہیں بس رسم نبھانے کے لیے
دل کی کیا پوچھتے ہو
سوچنے دو

ماسکو مارچ ۱۹۶۷ء

نہ کسی پہ زخم عیاں کوئی، نہ کسی کو فکر رفو کی ہے
نہ کرم ہے ہم پہ حبیب کا، نہ نگاہ ہم پہ عدو کی ہے
صفِ زاہداں ہے تو بے یقیں، صفِ میکشاں ہے تو بے طلب
نہ وہ صبح ورد و وضو کی ہے، نہ وہ شام جام و سبو کی ہے
نہ یہ غم نیا، نہ ستم نیا، کہ تری جفا کا گلا کریں
یہ نظر تھی پہلے بھی مضطرب، یہ کسک تو دل میں کبھو کی ہے

کفِ باغباں پہ بہارِ گل کا ہے قرض پہلے سے بیشتر
کہ ہر ایک پھول کے پیرہن، میں نمود میرے لہو کی ہے

نہیں خوفِ روزِ سیہ ہمیں، کہ ہے فیضؔ ظرفِ نگاہ میں
ابھی گوشہ گیر وہ اک کرن، جو لگن اُس آئنہ رُو کی ہے

________ سنہ ۱۹۶۷ء

سرِ وادیٔ سینا

(عرب اسرائیل جنگ کے بعد)

پھر برق فروزاں ہے سرِ وادیٔ سینا

پھر رنگ پہ ہے شعلۂ رخسارِ حقیقت

پیغامِ اجل، دعوتِ دیدارِ حقیقت

اے دیدۂ بینا

اب وقت ہے دیدار کا دم ہے کہ نہیں ہے

اب قاتلِ جاں چارہ گرِ کلفتِ غم ہے
گلزارِ ارم پر تَوِ صحرائے عدم ہے
پندارِ جنوں
حوصلۂ راہِ عدم ہے کہ نہیں ہے
پھر برق فروزاں ہے سرِ وادیٔ سینا، اے دیدۂ بینا
پھر دل کو مصفّا کرو، اس لوح پہ شاید

ما بینِ من و تو نیا پیماں کوئی اترے
اب رسمِ ستم حکمتِ خاصانِ زمیں ہے
تائیدِ ستم مصلحتِ مفتیٔ دیں ہے
اب صدیوں کے اقرارِ اطاعت کو بدلنے
لازم ہے کہ انکار کا فرماں کوئی اترے

(۲)

سنو کہ شاید یہ نورِ صیقل
ہے اُس صحیفے کا حرفِ اوّل
جو ہر کس و ناکسِ زمیں پر
دلِ گدایانِ اجمعیں پر
اتر رہا ہے فلک سے اب کے

سنو کہ اس حرفِ لم یزل کے

ہمیں تمہیں بندگانِ بے بس

علیم[1] بھی ہیں، خبیر[2] بھی ہیں

سنو کہ ہم بے زبان و بے کس

بشیر[3] بھی ہیں، نذیر[4] بھی ہیں

۱، ۲، ۳، ۴ (یہ الفاظ لغوی معنوں میں استعمال ہوئے ہیں)

ہر اک اولی الامر کو صدا دو

کہ اپنی فردِ عمل سنبھالے

اٹھے گا جب جمِّ سرفروشاں

پڑیں گے دار و رسن کے لالے، کوئی نہ ہوگا کہ جو بچالے

جزا سزا سب یہیں پہ ہوگی، یہیں عذاب و ثواب ہوگا

یہیں سے اٹھے گا شورِ محشر، یہیں پہ روزِ حساب ہوگا

دُعا

آئیے ہاتھ اٹھائیں ہم بھی
ہم جنہیں رسمِ دُعا یاد نہیں
ہم جنہیں سوزِ محبّت کے سوا
کوئی بت، کوئی خدا یاد نہیں
آئیے عرض گزاریں کہ نگارِ ہستی
زہرِ امروز میں شیرینیِ فردا بھر دے

وہ جنھیں تابِ گراں باریٔ ایّام نہیں
ان کی پلکوں پہ شب و روز کو ہلکا کر دے
جن کی آنکھوں کو رخِ صبح کا یارا بھی نہیں
ان کی راتوں میں کوئی شمع منوّر کر دے
جن کے قدموں کو کسی رہ کا سہارا بھی نہیں
ان کی نظروں پہ کوئی راہ اجاگر کر دے
جن کا دیں پیرویٔ کذب و ریا ہے اُن کو
ہمّتِ کفر ملے، جراُتِ تحقیق ملے
جن کے سر منتظرِ تیغِ جفا ہیں ان کو
دستِ قاتل کو جھٹک دینے کی توفیق ملے

عشق کا تیر نہاں جان تپاں ہے جس سے

آج اقرار کریں اور تپش مٹ جائے

حرفِ حق دل میں کھٹکتا ہے جو کانٹے کی طرح

آج اظہار کریں اور خلش مٹ جائے

یومِ آزادی ——— ۱۴ اگست ۱۹۶۷ء

دلدار دیکھنا

طوفاں بہ دل ہے ہر کوئی دلدار دیکھنا
گل ہو نہ جائے مشعلِ رخسار دیکھنا
آتش بہ جاں ہے ہر کوئی سرکار دیکھنا
لو دے اٹھے نہ طرۂ طرار دیکھنا

جذبِ مسافرانِ رہِ یار دیکھنا
سر دیکھنا، نہ سنگ، نہ دیوار دیکھنا
کوئے جفا میں قحطِ خریدار دیکھنا
ہم آگئے تو گرمیٔ بازار دیکھنا
اس دل نوازِ شہر کے اطوار دیکھنا
بے التفات بولنا، بیزار دیکھنا

خالی ہیں گرچہ مسند و منبر نگوں ہے خلق

رُعب قبا و ہیبتِ دستار دیکھنا

جب تک نصیب تھا ترا دیدار دیکھنا

جس سمت دیکھنا، گل و گلزار دیکھنا

پھر ہم تمیزِ روز و مہ و سال کر سکیں

اے یادِ یار پھر اِدھر اک بار دیکھنا

۱۹۸۲ء

ہارٹ اٹیک

دردا اتنا تھا کہ اس رات دلِ وحشی نے

ہر رگِ جاں سے الجھنا چاہا

ہر بُنِ مو سے ٹپکنا چاہا

اور کہیں دور ترے صحن میں گویا

پتا پتا مرے افسردہ لہو میں ڈھل کر

حسنِ مہتاب سے آزردہ نظر آنے لگا

میرے ویرانۂ تن میں گویا
سارے دُکھتے ہوئے ریشوں کی طنابیں کُھل کر
سلسلہ وار پتہ دینے لگیں
رخصتِ قافلۂ شوق کی تیاری کا
اور جب یاد کی بجھتی ہوئی شمعوں میں نظر آیا کہیں
ایک پل آخری لمحہ تری دلداری کا
درد اتنا تھا کہ اس سے بھی گزرنا چاہا
ہم نے چاہا بھی، مگر دل نہ ٹھہرنا چاہا

۱۹۶۷ء

۶۱۹۶۸

ضبط کا عہد بھی ہے شوق کا پیمان بھی ہے

مرثیے

ضبط کا عہد بھی ہے شوق کا پیمان بھی ہے
عہد و پیماں سے گزر جانے کو جی چاہتا ہے
درد اتنا ہے کہ ہر رگ میں ہے محشر برپا
اور سکوں ایسا کہ مرجانے کو جی چاہتا ہے

اگست ۱۹۶۸ء

مرثیے

(۱)

دور جا کر قریب ہو جتنے
ہم سے تم کب قریب تھے اتنے

اب نہ آؤ گے تم نہ جاؤ گے
وصل و ہجراں بہم ہوئے کتنے

(۳)

چاند نکلے کسی جانب تری زیبائی کا
رنگ بدلے کسی صورت شبِ تنہائی کا

دولتِ لب سے پھر اے خسروِ شیریں دہناں
آج ارزاں ہو کوئی حرف شناسائی کا

گرمیٔ رشک سے ہر انجمنِ گل بدناں
تذکرہ چھیڑے تری پیرہن آرائی کا

صحنِ گلشن میں کبھی اے شہِ شمشاد قداں
پھر نظر آئے سلیقہ تری رعنائی کا

ایک بار اور مسیحائے دلِ دل زدگاں
کوئی وعدہ، کوئی اقرار مسیحائی کا
دیدہ و دل کو سنبھالو کہ سرِ شامِ فراق
ساز و سامان بہم پہونچا ہے رسوائی کا

—— اگست ۱۹۶۸ء

(۳۷)

کب تک دل کی خیر منائیں، کب تک رہ دکھلاؤ گے
کب تک چین کی مہلت دو گے کب تک یاد نہ آؤ گے

بیتا دید امید کا موسم، خاک اُڑتی ہے آنکھوں میں
کب بھیجو گے درد کا بادل، کب برکھا برساؤ گے

عہدِ وفا یا ترکِ محبت، جو چاہو سو آپ کرو
اپنے بس کی بات ہی کیا ہے، ہم سے کیا منواؤ گے

کس نے وصل کا سورج دیکھا، کس پر ہجر کی رات ڈھلی
گیسوؤں والے کون تھے کیا تھے، ان کو کیا جتلاؤ گے

فیضؔ دلوں کے بھاگ میں ہے، گھر بھرنا بھی لٹ جانا بھی
تم اس حسن کے لطف و کرم پر کتنے دن اتراؤ گے

اکتوبر ۱۹۶۸ء

٦١٩٤٩

خورشیدِ محشر کی لو

خورشیدِ محشر کی لو

خورشید محشر کی لَو

آج کے دن نہ پوچھو مرے دوستو

دُور کتنے ہیں خوشیاں منانے کے دن

کُھل کے ہنسنے کے دن، گیت گانے کے دن

پیار کرنے کے دن، دل لگانے کے دن

آج کے دن نہ پوچھو، مرے دوستو
زخم کتنے ابھی بختِ بسمل میں ہیں
دشت کتنے ابھی راہِ منزل میں ہیں
تیر کتنے ابھی دستِ قاتل میں ہیں

آج کا دن زبوں ہے، مرے دوستو
آج کے دن تو یوں ہے مرے دوستو
جیسے درد و الم کے پرانے نشاں
سب چلے سوئے دل کارواں، کارواں
ہاتھ سینے پہ رکھو تو ہر استخواں
سے اٹھے نالۂ الاماں، الاماں

آج کے دن نہ پوچھو ، مرے دوستو
کب تمھارے لہو کے دریدہ علم
فرقِ خورشیدِ محشر پہ ہوں گے رقم
از کراں تا کراں کب تمھارے قدم
لے کے اٹھے گا وہ بحرِ خوں یم بہ یم
جس میں دُھل جائے گا آج کے دن کا غم

GIRLS COLLEGE
ACC. No.
18037
LIBRARY

سارے دردو الم، سارے جور و ستم

دور کتنی ہے خورشید محشر کی لَو

آج کے دن نہ پوچھو مرے دوستو

مارچ، اپریل ۶۹ء

۱۹۷۰ء

بالیں پہ کہیں رات ڈھل رہی ہے

اک سخن مطربِ زیبا کہ سلگ اٹھے بدن

جرسِ گل کی صدا

فرشِ نومیدیٔ دیدار

ٹوٹی جہاں جہاں پہ کمند

بالیں پہ کہیں رات ڈھل رہی ہے

یا شمع پگھل رہی ہے

پہلو میں کوئی چیز جل رہی ہے

تم ہو کہ مری جاں نکل رہی ہے

مئی جون سنہ ۶۰ء

اک سخنِ مطربِ زیبا کہ سلگ اُٹھے بدن
اک قدح ساقیٔ مہوش جو کرے ہوش تمام
ذکرِ صبحے کہ رُخِ یار سے رنگیں تھا چمن
یادِ شبہا کہ تنِ یار تھا آغوش تمام

جون سنہ ۷۰ء

جرسِ گل کی صدا

اس ہوس میں کہ پکارے جرسِ گل کی صدا
دشت و صحرا میں صبا پھرتی ہے یوں آوارہ
جس طرح پھرتے ہیں ہم اہلِ جنوں آوارہ

ہم پہ وارفتگیٔ ہوش کی تہمت نہ دھرو
ہم کہ رمّازِ رموزِ غمِ پنہانی ہیں
اپنی گردن پہ بھی ہے رشتہ فگن خاطرِ دوست
ہم بھی شوقِ رہِ دلدار کے زندانی ہیں

جب کبھی ابروئے دریار نے ارشاد کیا

جس بیاباں میں بھی ہم ہوں گے چلے آئیں گے

در کھلا دیکھا تو شاید انھیں پھر دیکھ سکیں

بند ہوگا تو صدا دے کے چلے جائیں گے

جولائی ۱۹۷۰ء

فرشِ نومیدیٔ دیدار

دیکھنے کی تو کسے تاب ہے لیکن اب تک
جب بھی اُس راہ سے گزرے تو کسی دکھ کی کسک
ٹوکتی ہے کہ وہ دروازہ کھلا ہے اب بھی
اور اُس صحن میں ہر سو یونہی پہلے کی طرح

فرشِ نومیدیٔ دیدار بچھا ہے اب بھی
اور کہیں یاد کسی دل زدہ بچے کی طرح
ہاتھ پھیلائے ہوئے بیٹھی ہے فریاد کناں
دل یہ کہتا ہے کہیں اور چلے جائیں جہاں
کوئی دروازہ عبث وا نہ ہو، بے کار کوئی
یادِ فریاد کا کشکول لیے بیٹھی ہو
محرمِ حسرتِ دیدار ہو دیوار کوئی
نہ کوئی سایۂ گل، ہجرتِ گل سے ویراں

یہ بھی کر دیکھا ہے سو بار کہ جب راہوں میں
دیس پردیس کی بے مہر گزرگاہوں میں
قافلے قامت و رخسار و لب و گیسو کے
پردۂ چشم پہ یوں اترے ہیں بے صورت و رنگ
جس طرح بند دریچوں پہ گرے بارشِ سنگ
اور دل کہتا ہے ہر بار چلو لوٹ چلو

اس سے پہلے کہ وہاں جائیں تو یہ دکھ بھی نہ ہو

یہ نشانی کہ وہ دروازہ کھلا ہے اب بھی

اور اس صحن میں ہر سو یونہی پہلے کی طرح

فرشِ نومیدیٔ دیدار بچھا ہے اب بھی

اگست سنہ ۶۰ء

ٹوٹی جہاں جہاں پہ کمند

رہا نہ کچھ بھی زمانے میں جب نظر کو پسند
تری نظر سے کیا رشتۂ نظر پیوند
ترے جمال سے ہر صبح پر وضو لازم
ہر ایک شب ترے در پر سجود کی پابند

نہیں رہا حرمِ دل میں اک صنمِ باطل
ترے خیال کے لات و منات کی سوگند
مثالِ زینہ و منزل بکارِ شوق آیا!
ہر اک مقام کہ ٹوٹی جہاں جہاں پہ کمند
خزاں تمام ہوئی کس حساب میں لکھیے
بہارِ گل میں جو پہنچے ہیں شاخِ گُل کو گزند

دریدہ دل ہے کوئی شہر میں ہماری طرح
کوئی دریدہ دہن شیخِ شہر کے مانند
شعار کی جو مداراتِ قامتِ جاناں
کیا ہے فیضؔ دردِ دل، دار فلک سے بلند

نومبر ۷۰ء

۱۹۷۱ء

شرحِ بے دردیٔ حالات نہ ہونے پائی

حذر کرو مرے تن سے

تہ بہ تہ دل کی کدورت

ہم سادہ ہی ایسے تھے کی یونہی پذیرائی

یار اغیار ہو گئے ہیں

غبارِ خاطرِ محفل ٹھہر جائے

شرحِ بے دردیٔ حالات نہ ہونے پائی
اب کے بھی دل کی مدارات نہ ہونے پائی

پھر وہی وعدہ جو اقرار نہ بننے پایا!
پھر وہی بات جو اثبات نہ ہونے پائی

پھر وہ پروانے جنھیں اذنِ شہادت نہ ملا
پھر وہ شمعیں کہ جنھیں رات نہ ہونے پائی

پھر وہی جاں بلبی لذّتِ مے سے پہلے
پھر وہ محفل جو خرابات نہ ہونے پائی

پھر دمِ دید رہے چشم و نظر دید طلب
پھر شبِ وصل ملاقات نہ ہونے پائی

پھر وہاں بابِ اثر جانیے کب بند ہوا
پھر یہاں ختم مناجات نہ ہونے پائی

فیضؔ سر پر جو ہر اک روز قیامت گزری
ایک بھی روزِ مکافات نہ ہونے پائی

——— ۲۳ مارچ ۱۹۷۱ء

حذر کرو مرے تن سے

سجے تو کیسے سجے قتلِ عام کا میلہ
کسے لبھائے گا میرے لہو کا واویلا
مرے نزار بدن میں لہو ہی کتنا ہے
چراغ ہو کوئی روشن نہ کوئی جام بھرے
نہ اس سے آگ ہی بھڑکے نہ اس سے پیاس بجھے
مرے فگار بدن میں لہو ہی کتنا ہے
مگر وہ زہرِ ہلاہل بھرا ہے نس نس میں

جسے بھی چھیڑو ہر اک بوند قہرِ افعی ہے
ہر اک کشید ہے صدیوں کے درد و حسرت کی
ہر اک میں مُہر بلب غیظ و غم کی گرمی ہے
حذر کرو مرے تن سے یہ سم کا دریا ہے
حذر کرو کہ مرا تن وہ چوبِ صحرا ہے
جسے جلاؤ تو صحنِ چمن میں دہکیں گے
بجائے سرو سمن میری ہڈیوں کے ببول
اسے بکھیرا تو دشت و دمن میں بکھرے گی
بجائے مشکِ صبا، میری جانِ زار کی دھول
حذر کرو کہ مرا دل لہو کا پیاسا ہے

مارچ ۷۱ء

تہ بہ تہ دل کی کدورت
میری آنکھوں میں امنڈ آئی تو کچھ چارہ نہ تھا
چارہ گر کی مان لی
اور میں نے گرد آلود آنکھوں کو لہو سے دھو لیا
میں نے گرد آلود آنکھوں کو لہو سے دھو لیا
اور اب ہر شکل و صورت
عالمِ موجود کی ہر ایک شے
میری آنکھوں کے لہو سے اس طرح ہم رنگ ہے

خورشید کا کندن لہو
مہتاب کی چاندی لہو
صبحوں کا ہنسنا بھی لہو
راتوں کا رونا بھی لہو

ہر شجر مینارِ خوں، ہر پھول خونیں دیدہ ہے
ہر نظر اک تارِ خوں، ہر عکس خوں مالیدہ ہے
موجِ خوں جب تک رواں رہتی ہے اس کا سرخ رنگ
جذبۂ شوقِ شہادت، درد، غیظ و غم کا رنگ
اور تھم جائے تو کجلا کر
فقط نفرت کا، شب کا، موت کا

ہر رنگ کے ماتم کا رنگ
چارہ گر ایسا نہ ہونے دے
کہیں سے لا کوئی سیلابِ اشک
جس سے وضو
کر لیں تو شاید دُھل سکے
میری آنکھوں، میری گرد آلود آنکھوں کا لہو

۸ اپریل ۷۱ء

ہم سادہ ہی ایسے تھے کی یوں ہی پذیرائی
جس بار خزاں آئی، سمجھے کہ بہار آئی

آشوبِ نظر سے کی ہم نے چمن آرائی
جو شے نظر آئی، گل رنگ نظر آئی

امیدِ تلطف میں رنجیدہ رہے دونوں
تو اور تری محفل میں اور مری تنہائی

واں ملّتِ بوالہوساں اور شورِ وفا جوئی
یاں خلوتِ کم سخناں اور لذّتِ رسوائی

یک جان نہ ہو سکے، انجان نہ بن سکے
یوں ٹوٹ گئی دل میں شمشیر شناسائی
اس تن کی طرف دیکھو جو قتل گہِ دل ہے
کیا رکھا ہے مقتل میں اے چشمِ تماشائی

یار اغیار ہو گئے ہیں،
اور اغیار مُصر ہیں کہ وہ سب
یارِ غار ہو گئے ہیں،
اب کوئی ندیم باصفا نہیں ہے
سب رند شراب خوار ہو گئے ہیں،

سنہ ۱۹۷۱ء

غبارِ خاطرِ محفل ٹھہر جائے

کہیں تو کاروانِ درد کی منزل ٹھہر جائے

کنارے آ لگے عمرِ رواں یا دل ٹھہر جائے

اماں کیسی کہ موجِ خوں ابھی سر سے نہیں گزری

گزر جائے تو شاید بازوئے قاتل ٹھہر جائے

کوئی دم بادبانِ کشتیٔ صہبا کو تہ رکھو
ذرا ٹھہرو، غبارِ خاطرِ منزل ٹھہر جائے
خمِ ساقی میں جز زہرِ ہلاہل کچھ نہیں باقی
جو ہو محفل میں اس اکرام کے قابل ٹھہر جائے

ہماری خامشی بس دل سے لب تک ایک وقفہ ہے
یہ طوفاں ہے جو پل بھر بر لبِ ساحل ٹھہر جائے
نگاہِ منتظر کب تک کرے گی آئنہ بندی
کہیں تو دشتِ غم میں یار کا محمل ٹھہر جائے

داغستان کے ملک الشعراء
رسول حمزہ
کے افکار

میں تیرے سپنے دیکھوں
بھائی
داغستانی خاتون اور شاعر بیٹا
بہ نوک شمشیر
آرزو
سالگرہ
ایک چٹان کے لیے کتبہ
تیرگی جال ہے اور بھالا ہے نور
نسخۂ الفت میرا
ادیبوں کے امدادی فنڈ کے لیے سفارش
ہم نے دیکھا ہے میگساروں کو
مرد دانا

میں تیرے سپنے دیکھوں

برکھا برسے چھت پر، میں تیرے سپنے دیکھوں

برف گرے پربت پر، میں تیرے سپنے دیکھوں

صبح کی نیل پری، میں تیرے سپنے دیکھوں

کوئل دھوم مچائے، میں تیرے سپنے دیکھوں

آئے اور اُڑ جائے، میں تیرے سپنے دیکھوں

باغوں میں پتے مہکیں، میں تیرے سپنے دیکھوں

شبنم کے موتی، پلکیں، میں تیرے سپنے دیکھوں

اس پیار میں کوئی دھوکا ہے

تو نار نہیں کچھ اور ہے شئے

ورنہ کیوں ہر ایک سمے

میں تیرے سپنے دیکھوں

بھائی

آج سے بارہ برس پہلے بڑا بھائی مرا
اسٹالین گراڈ کی جنگاہ میں کام آیا تھا
میری ماں اب بھی لیے پھرتی ہے پہلو میں یہ غم
جب سے اب تک ہے وہی تن پہ ردائے ماتم
اور اس دکھ سے مری آنکھ کا گوشہ تر ہے
اب مری عمر بڑے بھائی سے کچھ بڑھ کر ہے

داغستانی خاتون اور شاعر بیٹا

اس نے جب بولنا نہ سیکھا تھا
اس کی ہر بات میں سمجھتی تھی
اب وہ شاعر بنا ہے نامِ خدا
لیکن افسوس کوئی بات اس کی
میرے پلّے ذرا نہیں پڑتی

بہ نوکِ شمشیر

میرے آبا کہ تھے نامحرمِ طوق و زنجیر
وہ مضامیں جو ادا کرتا ہے اب میرا قلم
نوکِ شمشیر پہ لکھتے تھے بہ نوکِ شمشیر
روشنائی سے جو میں کرتا ہوں کاغذ پہ رقم
سنگ و صحرا پہ وہ کرتے تھے لہو سے تحریر

آرزو

مجھے معجزوں پہ یقیں نہیں مگر آرزو ہے کہ جب قضا

مجھے بزمِ دہر سے لے چلے

تو پھر ایک بار یہ اذن دے

کہ لحد سے لوٹ کے آسکوں

ترے در پہ آکے صدا کروں

تجھے غمگسار کی ہو طلب تو ترے حضور میں آرہا ہوں

یہ نہ ہو تو سوئے رہِ عدم میں پھر ایک بار روانہ ہوں

سالگرہ

شاعر کا جشنِ سالگرہ ہے، شراب لا،
منصب، خطاب، رتبہ انھیں کیا نہیں ملا
بس نقص ہے تو اتنا کہ ممدوح نے کوئی
مصرع کسی کتاب کے شایاں نہیں لکھا

ایک چٹان کے لیے کتبہ

جواں مردی اسی رفعت پہ پہنچی
جہاں سے بزدلی نے جست کی تھی

تیرگی جال ہے اور بھالا ہے نور

اک شکاری ہے دن، اک شکاری ہے رات

جگ سمندر ہے جس میں کنارے سے دور

مچھلیوں کی طرح ابنِ آدم کی ذات

جگ سمندر ہے ساحل پہ ہیں ماہی گیر

جال تھامے کوئی، کوئی بھالا لیے

میری باری کب آئے گی کیا جانیے

دن کے بھالے سے مجھ کو کریں گے شکار

رات کے جال میں یا کریں گے اسیر؟

نسخۂ الفت میرا

گر کسی طور ہر اک الفتِ جاناں کا خیال
شعر میں ڈھل کے ثنائے رُخِ جانانہ بنے
پھر تو یوں ہو کہ مرے شعر و سخن کا دفتر
طول میں طولِ شبِ ہجر کا افسانہ بنے
ہے بہت تشنہ مگر نسخۂ الفت میرا
اس سبب سے کہ ہر اک لمحۂ فرصت میرا
دل یہ کہتا ہے کہ ہو قربتِ جاناں میں بسر

ادیبوں کے امدادی فنڈ کے لیے سفارش

فنڈ والوں سے گزارش ہے کہ کچھ صدقۂ زر

سائلِ محولہ بالا کو ملے بارِ دگر

پوچ لکھتے ہیں جو وہ لکھتے ہیں، تسلیم، مگر

ان کی اولاد و اعزّا کو نہیں اس کی خبر

آلِ بیہودہ نویساں کے لیے نانِ جویں

ٹالسٹائے کے گھرانے سے اہم کم تو نہیں